مولانا عبدالرحمان کیلانی

قسط (۴) آخری

مراسلات متعلقہ

# روح — مقام قبر — سماع موتیٰ

## قبر کے عام مفہوم پر عثمانی صاحب کے اعتراضات:

قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا لینے پر عثمانی صاحب اور اسی طرح موجودہ دور کے بعض دیگر لوگوں کو مندرجہ ذیل قسم کے اعتراضات ہیں۔

۱۔ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغیچہ ہوتا ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ ایک ہی قبر میں کئی مردے دفن ہوتے ہیں۔ اب بتلائیے کہ اس قبر میں عذاب ہو رہا ہے یا ثواب؟

۲۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب منکر نکیر آتے ہیں تو مردے کو قبر میں بٹھلا دیا جاتا ہے۔ پھر مومن کے لیے یہ قبر کشادہ کی جاتی ہے حالانکہ اس زمینی گڑھے میں اتنی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس سے برزخی قبر ہی مراد لی جائے۔

۳۔ حدیث میں آیا ہے کہ بدکردار انسان کو ستر ایسے زہریلے سانپ ڈستے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی زمین کو ڈس لے تو زمین سبزہ اگانا چھوڑ دے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ زمین نے آج تک سبزہ اگانا تو چھوڑا نہیں۔ لہٰذا قبر سے مراد

یہ زیلفی گڑھا لینا درست نہیں۔

۴۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ قبریں ظلمت سے بھری ہوتی ہیں۔ میری دُعا سے وُہ روشن ہو جاتی ہیں۔ اب اگر ایک قبر میں نیک و بد دونوں قسم کے مُردے ہوں تو کیا صورت ہو گی؛ کیا ان سب کو اس نور سے فائدہ پہنچے گا؛

۵۔ زانیوں کی قبریں دنیا میں مختلف مقامات پر ہوتی ہیں لیکن رسول اللہؐ نے خواب میں دیکھا کہ انہیں ایک ہی جگہ ایک تنور میں عذاب ہو رہا تھا وغیرہ وغیرہ۔

یہ اور اس قسم کے دوسرے اعتراضات کا جواب دراصل مَیں اپنے مقالہ میں دے چکا ہوں۔ مگر معلوم ہوتا ہے، ان حضرات نے اپنے مخصوص قسم کے نکات پر ہی نظر ڈالی۔ لہٰذا اب اِسے ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ فرض کیجئے ایک کمرے میں دو آدمی سو رہے ہیں، اور خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایک تو خواب کی حالت میں پٹ رہا ہے لیکن دوسرا خواب ہی میں دعوتیں اڑا رہا ہے اور ایک تیسرا آدمی ان دونوں کے پاس بیٹھا جاگ رہا ہے۔ اب دیکھیے یہ تینوں آدمی ایک، دوسرے اور تیسرے کے حالات سے قطعًا بے خبر ہیں کیونکہ تینوں کے عالم الگ الگ ہیں۔ اگرچہ ہمارے محسوسات کے لحاظ سے تینوں ایک کمرے میں، ایک مقام پر اور ایک عالم و دنیا میں ہیں۔

عالمِ برزخ کا تھوڑا بہت تصوّر، جتنا کہ اس عالم و دنیا میں ممکن ہے، خواب اور اس کے کوائف و واردات میں غور و فکر کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ نیند بھی زندگی اور موت کے درمیان برزخ ہے اور اسی لیے نیند کو موت[۱] سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ نیند میں چونکہ زندگی کے آثار غالب ہوتے ہیں اس لیے قرآن نے اس دَور کو زندگی سے تعبیر کیا ہے اور برزخ میں چونکہ موت کے اثرات غالب ہوتے ہیں اس لیے قرآن نے اسے موت سے تعبیر کیا ہے۔ اگرچہ اس میں بھی زندگی کے کچھ نہ کچھ آثار پائے جاتے ہیں اور اسی لیے اس

---

[۱] اس کی وضاحت مَیں اپنے مقالہ میں پیش کر چکا ہوں۔

موت کے دور کو برزخی زندگی بھی کہہ دیا جاتا ہے۔

اس تصریح سے عثمانی صاحب کے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ کیا روحیں دو ہیں؟ ایک تو عذاب و ثواب بھگت رہی ہے اور دوسری دنیا میں اپنے قبر میں پڑے ہوئے جسم میں موجود ہوتی ہے تو کیا روحیں دو ہوتی ہیں؟ اگر اس دنیا میں اس طرح کی دو روحوں کے وجود کا امکان ہے تو اس دنیا میں کیوں نہیں ہو سکتا؟

عثمانی صاحب فرماتے ہیں "حدیث میں آیا ہے کہ بدکردار انسان کو ایسے زہریلے ستر سانپ ڈستے ہیں کہ اگر ان میں ایک سانپ زمین کو ڈس لے تو وہ سبزہ اگانا چھوڑ دے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ زمین نے سبزہ اگانا تو چھوڑا نہیں۔ لہٰذا قبر سے یہ زمینی گڑھا مراد لینا درست نہیں۔"

یہ بھی عجیب قسم کی منطق ہے کہ سانپ ڈسے تو انسان کو اور سبزہ اگانا زمین چھوڑ دے، وہ کیوں؟ آخر اس سانپ نے زمین کو تو ڈسا نہیں، پھر جب ہم خود اس بات کے قائل ہیں کہ عذاب و ثواب قبر کا بیشتر انحصار روح یا روح کے جسم پر ہوتا ہے۔ البتہ اس کی شدت سے کبھی کبھار قبر میں پڑا ہوا جسدِ عنصری بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ تو بدکردار انسان کے اس عذاب سے آخر زمین سبزہ اگانا کیوں چھوڑ دے؟

یہ اور اس قبیل کے دوسرے اعتراضات میں عام غلطی جو ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بات تو کرتے ہیں روح اور عالم برزخ کی، اور اسے پرکھنا چاہتے ہیں انسانی عقل اور محسوسات سے، حالانکہ یہ بات اصولاً غلط ہے۔ کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ روح کے متعلق انسان کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ تو پھر اس تھوڑے علم کی بنیاد پر ایک نظریہ قائم کرنا، پھر اس نظریہ کو عقیدہ کا رنگ دینا پھر اس میں اتنا متشدد اور متعصب ہو جانا کہ جو شخص اس نظریہ کے خلاف بات کرے اسے کافر و مشرک کے القاب دے ڈالنا، آخر یہ کہاں کی دانشمندی ہے؟

شہداء اور عالم برزخ:

شہداء کے متعلق قرآن کریم میں ایک جگہ تو یہ مذکور ہے کہ "انہیں مُردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔" (البقرۃ ۱۵۴) اور دوسری جگہ فرمایا کہ "اللہ کی راہ میں مارے جانے والوں کو مُردہ گمان بھی نہ کرو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں رزق دیے جاتے ہیں۔" اور احادیث سے

ثابت ہے کہ شہداء کو سبز رنگ کے پرندوں کا جسم عطا کیا جاتا ہے۔ وہ جنت کے باغوں میں لہلہاتے، جنت کے میوے کھاتے اور عرش الٰہی کے نیچے لٹکتی ہوئی سنہری قندیلوں میں بسیرا کرتے ہیں۔ (ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ ص ۳۴۲)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد برزخی زندگی تو سب ہی کو ملتی ہے خواہ وہ مومن ہو یا کافر۔ اسی طرح ہر کوئی عذاب و ثواب سے بھی دوچار ہوتا ہے تو پھر شہداء کی خصوصیت کیا رہی؟ کیا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ انہیں مُردہ نہ کہو یا نہ سمجھو محض ازراہِ اعزاز ہے؟

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ بات محض ازراہِ عزت و احترام نہیں۔ بلکہ وہ فی الحقیقت زندگی کے دَور میں ہیں جیسا کہ قرآن میں دونوں مقامات پر "بَلْ اَحْیَاءٌ" کے الفاظ آئے ہیں جبکہ باقی سب انسانوں کے لیے "اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَاءٍ" کے الفاظ آئے ہیں۔ اور شہداء کی فضیلت یہ ہے کہ ان پر سے مرحلہ ۳ یعنی مرنے کے بعد سے لے کر یوم البعث تک کا دور۔ جسے برزخی زندگی بھی کہتے ہیں اور قرآن اسے موت کا دور بتلاتا ہے، یکسر اٹھا لیا جاتا ہے اور وہ مرحلہ ۲ یعنی دنیوی زندگی میں شہادت پاتے ہی فوراً سیدھے مرحلہ ۴ یعنی مکمل اور دائمی زندگی کے دَور میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان سے منکر نکیر کے سوال و جواب نہیں ہوتے۔ قرآنِ کریم کے الفاظ "بَلْ اَحْیَاءٌ" کا یہی مطلب ہے جبکہ عثمانی صاحب شہداء کی برزخی زندگی تسلیم کرتے ہیں۔ جیسا کہ وہ فرماتے ہیں:

"اس طرح سے صاف بتلا دیا گیا کہ شہداء اپنے رب کے پاس ہیں اور وہاں رزق پا رہے ہیں۔ ان قبروں کے اندر زندہ نہیں۔ ان کی زندگی برزخی ہے دنیاوی نہیں۔" (یہ قبریں یہ آستانے ص ۱۰)

اب سوال یہ ہے کہ اگر شہداء کی زندگی بھی برزخی ہے اور عام انسانوں کی بھی، تو عام انسانوں کے لیے "اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَاءٍ" اور شہداء کو "بَلْ اَحْیَاءٌ" کیوں کہا گیا؟

موت کے بعد شہداء اور عام انسانوں میں دوسرا فرق یہ ہے کہ شہداء کو جنت میں سبز پرندوں کا جسم عطا ہوتا ہے اور یہ جسم حقیقی اور مستقل ہوتا ہے جبکہ

دوسروں کی رُوح کو ان کا اپنا ہی جسم یا بقول عثمانی صاحب نیا جسم عطا ہوتا ہے جو ہر آن بنتا بگڑتا رہتا ہے۔

۲۔ اعادۂ روح اور عذاب قبر:

اعادۂ روح کے متعلق جتنی بھی احادیث آتی ہیں، عثمانی صاحب نے ان کو یا تو مجروح و موضوع قرار دیا ہے یا پھر ان کی کوئی نئی اور مضحکہ خیز تاویل پیش کر دی ہے۔ اثبات اعادۂ روح کے موضوع پر ایک الگ پمفلٹ شائع ہو چکا ہے جس میں عثمانی صاحب کی ان "علمی تحقیقات" کا بھرپور جائزہ پیش کیا گیا ہے اور یہ پمفلٹ ہم محدث کے کسی اگلے شمارہ میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سردست ہم صرف بخاری کی اسی حدیث سے تعرض کریں گے جو موضوع زیر بحث میں اکثر پیش کی جاتی ہے۔ پھر اس سے ممکنہ نتائج پر غور کریں گے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ:

"اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا وُضِعَ فِيْ قَبْرِهٖ وَتَوَلّٰى عَنْهُ اَصْحَابُهٗ اِنَّهٗ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ اَتَاهُ مَلَكَانِ فَيُقْعِدَانِهٖ فَيَقُوْلَانِ مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ لِمُحَمَّدٍ فَاَمَّا الْمُؤْمِنُ فَيَقُوْلُ اَشْهَدُ اَنَّهٗ عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ فَيُقَالُ لَهٗ اُنْظُرْ اِلٰى مَقْعَدِكَ مِنَ النَّارِ قَدْ اَبْدَلَكَ اللّٰهُ بِهٖ مَقْعَدًا مِّنَ الْجَنَّةِ فَيَرَاهُمَا جَمِيْعًا۔ قَالَ قَتَادَةُ وَذُكِرَ لَنَا اَنَّهٗ يُفْسَحُ لَهٗ فِيْ قَبْرِهٖ ثُمَّ رَجَعَ اِلٰى حَدِيْثِ اَنَسٍ قَالَ: وَاَمَّا الْمُنَافِقُ وَالْكَافِرُ فَيُقَالُ لَهٗ مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ فَيَقُوْلُ: لَا اَدْرِيْ، كُنْتُ اَقُوْلُ مَا يَقُوْلُ النَّاسُ فَيُقَالُ لَا دَرَيْتَ وَلَا تَلَيْتَ فَيُضْرَبُ بِمَطَارِقَ مِنْ حَدِيْدٍ ضَرْبَةً فَيَصِيْحُ صَيْحَةً يَسْمَعُهَا مَنْ يَّلِيْهِ غَيْرُ الثَّقَلَيْنِ" (بخاری، کتاب الجنائز۔ باب ماجاء فی عذاب القبر)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب آدمی اپنی قبر میں

رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھی واپس لوٹتے ہیں تو بلاشبہ وہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے (اسی وقت) اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اُسے اٹھا کر بٹھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں: "تو اس شخص یعنی محمدؐ کے بارے میں کیا اعتقاد رکھتا تھا؟" اب اگر وہ ایماندار ہے تو کہتا ہے، کہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں"۔ پھر اس سے کہا جاتا ہے۔ "تو دوزخ میں اپنا ٹھکانا دیکھ لے اللہ تعالیٰ نے اس کے بدل تجھ کو جنت میں ٹھکانا دیا"۔ تو وہ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھے گا۔ قتادہ کہتے ہیں "اور ہم سے یہ بھی بیان کیا گیا کہ اس کی قبر کشادہ کر دی جاتی ہے"۔ پھر انس کی حدیث بیان کرتے ہوئے کہا "اور اگر وہ منافق یا کافر ہے تو اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو اس شخص کے بارے میں کیا اعتقاد رکھتا ہے"؟ تو وہ کہتا ہے۔ "میں نہیں جانتا۔ میں تو وہی کچھ کہتا تھا جو لوگ کہتے تھے"۔ پھر اس سے کہا جائے گا کہ "نہ تو تُو خود سمجھا اور نہ ہی خود پڑھا"۔ اور لوہے کے ہتھوڑوں سے اسے ایسی مار پڑے گی کہ وہ بلبلا اٹھے گا۔ اور اس کی یہ چیخ جن و انسان کے سوا تمام آس پاس کی چیزیں سنتی ہیں"۔

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں:

۱۔ بنیادی طور پر "وَضَعَ" کا لغوی معنی اتارنا اور نیچے رکھنا ہے۔ (مفردات للامام الراغب) اور "وُضِعَ فِی قَبْرِہٖ" کے الفاظ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے۔ رُوح کو کسی برزخی جسم میں داخل کرنے کے لیے "وُضِعَ" کا لفظ استعمال نہیں ہو گا۔

۲۔ "وَتَوَلّٰی عَنْہُ اَصْحَابُہٗ" کے الفاظ سے بھی قبر سے مراد زمینی گڑھا ہے کیونکہ میت کے ساتھی اسی زمینی قبر سے واپس جاتے ہیں نہ کہ برزخی قبر سے۔

۳۔ جن و انس کے سوا تمام اشیاء میت کے عذاب، آہ و بکا کو سنتی ہیں۔ جنوں کے متعلق ہم وثوق سے کہہ نہیں سکتے۔ لیکن انسان تو اسی زمین پر بستے ہیں اور "مَنْ یَّلِیْہِ" کے الفاظ سے یہ بھی واضح ہے کہ یہ اس قبر کے آس پاس کی اشیاء اور

جن و انس ہیں۔ اب انسان چونکہ اسی زمین کے پاس ہو سکتے ہیں۔ برزخی قبر کے پاس نہیں ہوتے۔ لہٰذا قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے۔

"إِنَّهُ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ" (یعنی مُردہ ان واپس جانے والوں کے جوتوں کی آواز سنتا ہے) کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس وقت اس جسم میں رُوح بھی ہوتی ہے۔ جو موت کے وقت فرشتے نکال کر لے گئے تھے۔ اس سے اعادۂ رُوح کا اثبات ہوتا ہے۔ اب یہ سوال کہ رُوح فرشتے اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ یا یہ رُوح ان کی آمد سے پہلے لوٹائی جاتی ہے۔ اور پھر یہ روح واپس کب اور کس طرح جاتی ہے؟ ایسے سوال ہیں جن کے جاننے کے ہم مکلف نہیں ہیں۔ اور یہ سوال ایسے ہی ہیں جیسے کوئی یہ پوچھے کہ عیسیٰؑ جن مُردوں کو زندہ کرتے تھے، وُہ دوبارہ کب مرتے تھے؟ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ رُوح کا اصل ٹھکانا یہ دنیاوی قبر نہیں ہے اور رُوح کی یہ واپسی ایک اضطراری امر اور اللہ کے حکم کے تحت ہے۔

۵۔ "فَيُقْعِدَانِهِ" یعنی وُہ دونوں فرشتے قبر میں لیٹی ہوئی میت کو اٹھا کر بٹھلا دیتے ہیں۔ فرشتوں کے اس عمل سے بھی قبر کے زمینی گڑھا ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ کیونکہ برزخی قبر تو محض رُوح کو ایک نیا جسم ملنے کا نام ہے اور یہی نیا جسم اس کی برزخی قبر ہے۔ اس برزخی قبر میں فرشتوں کے میت کو اُٹھا کر بٹھلانے کا تصور ہی کب پیدا ہوتا ہے؟

۶۔ "قبر میں فرشتے لیٹی ہوئی میت کو اٹھا کر بٹھلا دیتے ہیں۔ نیز مومن کے لیے قبر کھول دی جاتی ہے۔" اس سے عثمانی صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ چونکہ قبر کو اسی وقت اکھاڑنے سے ہم کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں دیکھتے۔ لہٰذا قبر سے مراد زمینی گڑھا نہیں ہو سکتا اور اس سے مراد بس برزخی قبر ہی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ اس سے بالکل دوسرا نتیجہ نکالتے ہیں اور وُہ یہ ہے کہ قبر کی اندرونی دنیا، اس کی خارجی دُنیا سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ قبر میں رکھی ہوئی میت سے جو واردات و حوادث پیش آ رہے ہوتے ہیں۔ اس سے قبر کو اکھاڑنے والا شخص کبھی مطلع نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھنے والا شخص اپنے خواب میں

نہایت سنسنی خیز حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن اس کے پاس بیٹھنے اور جاگنے والے کو اس کا علم تک نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ دونوں اسی دنیا میں اور ایک ہی جگہ پر ہوتے ہیں۔ لہٰذا برزخی قبر کے نظریہ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اور یہ بات میں پہلے بھی کئی بار واضح کر چکا ہوں کہ اس دُنیا میں خواب میں رنج و راحت سے دوچار ہونے والی رُوح کا اپنے مادی جسم سے نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے۔ لہٰذا اس پر زندگی کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن قبر یا عالم برزخ میں اس رنج و راحت سے دوچار ہونے والی رُوح کا اپنے جسم سے تعلق نہایت کمزور اور کبھی کبھار ہوتا ہے۔ پھر یہ تعلق بھی رُوح کے اپنے بس کی بات نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس دور کو "اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَاءٍ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۷۔ امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں یہ روایت درج کر کے ثابت کر دیا ہے کہ وہ قبر میں اعادۂ رُوح کے قائل ہیں۔ پھر انہوں نے یہ روایت ایک ممتاز صحابی حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کی ہے جس سے معلوم ہوا کہ حضرت انسؓ بن مالک بھی اعادۂ روح کے قائل تھے۔ پھر درمیان میں جتنے حضرات سے اس کا سلسلہ سند منسلک ہے، یہ سب حضرات بھی اعادۂ رُوح کے قائل تھے۔ پھر آخر امام احمد بن حنبلؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام ابن قیمؒ، ابن کثیرؒ، ابن حجرؒ اور ایک "جم غفیر" نے کونسا ایسا جرم کیا ہے جس کی پاداش میں آپ انہیں بدعقیدہ، گمراہ، کافر و مشرک اور ایمان سے خالی وغیرہ وغیرہ القابات سے نوازتے ہیں؟

اب آپ کے ممدوحین میں سے ایک امام ابوحنیفہؒ رہ جاتے ہیں جن کے سوال و جواب کو غلط جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ جہاں تک رُوح کے قبر میں واپس آنے اور پھر ہر وقت موجود رہنے کا تعلق ہے، اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ اصل سوال زیر بحث یہ ہے کہ کیا کسی وقت اعادۂ روح ممکن بھی ہے یا نہیں، خواہ یہ محض استثنائی صورت میں ہی کیوں نہ ہو؟ اس سوال کے جواب میں کسی صحابیؓ، امام بخاریؒ یا امام ابوحنیفہؒ کا قول پیش فرمائیے۔ تو قطع نزاع کے لیے دلیل کا کام دے سکتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے واقعہ سے تو بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ رُوح قبر میں موجود نہیں ہوتی۔ بلکہ اہل قبور "اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَاءٍ" ہوتے ہیں۔ اور یہ بات ہم بھی

تسلیم کرتے ہیں۔

اسی طرح آپ کسی صحابیؓ، امام بخاریؒ یا امام ابوحنیفہؒ، بلکہ ان کے علاوہ علمائے متقدمین میں سے کسی ایک کا نام بتلا سکتے ہیں جس نے قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا لینے کی بجائے آپ کی مزعومہ برزخی قبر لیا ہو؟

ہم نے یہاں بخاری سے صرف ایک حدیث عذابِ قبر سے متعلق درج کی ہے جبکہ دوسری کتبِ صحاح میں بھی ایسی صحیح روایات موجود ہیں۔ پھر ایسی صحیح روایات کے علی الرغم ہم اس استثنائی صورت سے کیسے انکار کر سکتے ہیں کہ اسی زمینی قبر میں فرشتے آتے ہیں تو میت کی رُوح واپس قبر میں لوٹائی جاتی ہے۔ اسی زمینی گڑھے میں فرشتے سوال و جواب کرتے ہیں اور یہیں سے میت کو عذاب و ثواب شروع ہو جاتا ہے۔ ہم میت کے جسم سے اس کی رُوح کے اس استثنائی، کمزور اور غیر مستقل تعلق سے کیسے انکار کر سکتے ہیں جبکہ ہم اس دنیا میں خواب کی صورت میں اس سے ملتی جلتی باتیں مشاہدہ بھی کر لیتے ہیں اور یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا ہے ہی نہیں؟ اسی طرح اس زمینی گڑھے میں ہونے والے سوال و جواب اور عذاب و ثواب سے قطعی انکار ہمارے لیے ناممکن ہے۔

## "قَرْعَ نِعَالِهِمْ" کی عثمانی تشریح:

"قَرْعَ نِعَالِهِمْ" کی شرح میں آپ کو بخاری کے کسی شارح الزین بن المنیر کی شرح بہت پسند آئی ہے اور اس شرح کا اشفاق صاحب نے بھی اپنے خط میں ذکر فرمایا ہے۔ اور وہ شرح یہ ہے کہ "نِعَالِهِمْ" میں "هُمْ" کی ضمیر بعد میں آنے والے الفاظ "أَتَاهُ مَلَكَانِ" کی طرف پھرتی ہے۔ اب اس تشریح پر کچھ اعتراض بھی وارد ہوتے تھے۔ جن کے جواب بھی عثمانی صاحب نے دیے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو اعتراضات اور ان کے جوابات چونکہ علمی انداز کے ہیں، اس لیے ہم ان کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

---

لہ گو ہم سماعِ موتیٰ کے مسئلہ میں ان سب حضرات سے کلی طور پر متفق نہیں۔ تاہم ہم ان کے لیے ایسے غلط قسم کے القابات کسی صورت پسند نہیں کرتے۔

**اعتراض ۱:** "هُمْ" جمع کی ضمیر ہے۔ اگر اس سے مراد فرشتے ہوتے تو تثنیہ کی ضمیر "هُمَا" آنا چاہئے تھی۔

اس کا جواب عثمانی صاحب یہ دیتے ہیں کہ "عربی زبان میں دونوں طریقے رائج ہیں۔ تثنیہ کے لیے جمع کا استعمال عام ہے جیسے قرآن کی آیت ہے:

"قَالَ كَلَّا فَاذْهَبَا بِآيَاتِنَا إِنَّا مَعَكُم مُّسْتَمِعُونَ" (شعراء ۱۵)

"فرمایا، تم دونوں جاؤ ہماری نشانیاں لے کر۔ ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سنتے رہیں گے۔"

"فَاذْهَبَا" میں تثنیہ کی ضمیر ہے اور "مَعَكُم" میں جمع کی۔

اسی طرح بخاری کی حدیث خضر میں یہ الفاظ ہیں:

"فَمَرَّتْ بِهِمَا سَفِينَةٌ فَكَلَّمُوهُمْ أَنْ يَحْمِلُوهُمَا"

"پس گزری ان دونوں (موسیٰ و خضر) کے پاس سے ایک کشتی، پس انہوں نے (جمع کا صیغہ) کشتی والوں سے بات کی کہ وہ ان دونوں کو کشتی میں سوار کرلیں" (بخاری عربی جلد ۱ ص ۲۳، سطر ۱۵، ۱۶)

"فَكَلَّمُوهُمْ" کے ساتھ ساتھ "فَكَلَّمَاهُمْ" بھی بخاری کی روایت میں ہے مگر حاشیہ پر اور نسخہ کے طور پر متن میں "كَلَّمُوهُمْ" کو ہی ترجیح دی گئی ہے جو تثنیہ کے بجائے جمع کا صیغہ ہے۔"

## جواب:

عربی زبان میں تثنیہ کے لیے جمع کا صیغہ عام نہیں۔ اگر عام ہوتا تو گرائمر کی کتابوں میں اس کا ضرور ذکر پایا جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ تثنیہ کی صورت میں جمع کا استعمال شاذ ہے اور اس کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ مثلاً:

پہلی مثال میں "كُم" کی ضمیر "مَعَ" کی وجہ سے آتی ہے۔ گویا فرعون کی طرف جانے والے تو صرف دو تھے مگر سننے والوں میں اللہ بھی ساتھ شامل ہو گیا اور ضمیر جمع میں بدل گئی۔ دوسری مثال میں ایک مقام پر "كَلَّمُوهُمْ" اس لیے آیا ہے کہ موسیٰ کے ساتھ ان کا ایک ساتھی (یوشع بن نون) بھی تھا۔ جس کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔ لیکن قابل ذکر چونکہ دو ہی ہستیاں تھیں یعنی موسیٰ و خضر، اس لیے اکثر تثنیہ

کا ضمیر آیا اور ایک جگہ اشتباہ کی وجہ سے جمع کا ضمیر بھی آیا۔ اگرچہ اس کی حاشیہ میں تصحیح کر دی گئی۔

اعتراض ۲:

"ھُمْ" کی ضمیر اگر "مَلَکَانِ" سے متعلق ہے تو یہ پہلے کیسے آ گئی؟ اس کا جواب عثمانی صاحب یوں دیتے ہیں کہ:

"عربی ادب کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر بات بالکل صاف ہو اور سننے والے سے غلطی کرنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو پہلے اسم کا ذکر نہیں کیا جاتا جیسے قرآن میں ہے:

"اِنَّا اَنْشَأْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا" (الواقعہ ۳۵، ۳۶)

"ہم نے ان کو (ان کی بیویوں کو) ایک خاص اٹھان سے اٹھایا ہے اور ہم اُن کو رکھیں گے کنواریاں۔"

سورۂ یٰسین میں:

"وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِیْ لَهٗ" (یٰسین ۶۹)

"اور ہم نے اس (پیغمبرؐ) کو شعر کی تعلیم نہیں دی۔"

جواب ۱: پہلی مثال اس لحاظ سے غلط ہے کہ "اِنَّا اَنْشَأْنٰهُنَّ" سے چند آیات پہلے "حُوْرٌ عِیْنٌ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ" کا ذکر آ چکا ہے۔ بعد میں جنت کی چند صفات بیان کر کے "اَنْشَأْنٰهُنَّ" کی ضمیر "حُوْرٌ عِیْنٌ" کی طرف پھیری گئی ہے جو درست ہے۔ لیکن عثمانی صاحب اسے خواہ مخواہ "اَبْكَارًا" کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ یہ لفظ بعد میں آیا ہے۔

جواب ۲: مثال تو ایسی درکار تھی کہ ضمیر پہلے آئے اور اس کا مرجع اسم بعد میں ہو۔ پہلی مثال میں آپ نے بعد میں مرجع "اَبْكَارًا" جو بتلایا ہے، وہ ویسے ہی غلط ہے اور دوسری مثال میں ضمیر کا مرجع اسم مذکور ہی نہیں۔ تو ڈاکٹر صاحب کا جواب درست کیسے سمجھا جائے؟

اب دیکھیے کہ "قَرْعَ نِعَالِهِمْ" کا مرجع "اَصْحَابُهٗ" واضح طور پر جب موجود ہے تو "ھُمْ" کا مرجع آخر "مَلَکَانِ" کیوں قرار دیا جائے؟ لیکن ان سب باتوں کے

باوجود آپ کو "الزین بن المنیر" کی تشریح اس لیے پسند آگئی کہ یہ آپ کے نظریہ کی تائید کرتی تھی۔

**سماعِ موتیٰ:**

قرآن کی رُو سے یہ ثابت ہے کہ مُردے سن نہیں سکتے اور ہم خود بھی اسی بات کے قائل ہیں!— پھر قرآن ہی کی رُو سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس قانونِ الٰہی میں بھی استثناء موجود ہے اور وُہ استثنا یہ ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ یُسْمِعُ مَنْ یَّشَآءُ" یعنی "اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سُنا سکتا ہے"۔ اب اگر سماعِ موتیٰ کا یکسر انکار کر دیا جائے تو "اسماعِ موتیٰ" کا از خود انکار ہو گیا۔ گویا یہ مسئلہ صرف "سماعِ موتیٰ" کا نہیں بلکہ "اسماعِ موتیٰ" کا بھی ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو سُنا تو سکتا ہے مگر سُنایا کبھی نہیں تو یہ بات بھی یکسر غلط ہے۔ قلیبِ بدر کے مقتولین کو اللہ تعالیٰ نے سُنا دیا تھا۔ عیسیٰؑ اللہ کے اذن سے مُردوں کو "قُمْ" کہتے تھے تو وُہ مردے یہ حکم سن کر ہی جی اٹھتے اور اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ گو ایسے واقعات کا انداز معجزانہ ہی سہی لیکن ان کا انکار تو نہیں کیا جا سکتا۔ پھر چونکہ "اسماعِ موتیٰ" اور "سماعِ موتیٰ" دونوں لازم و ملزوم ہیں لہٰذا "سماعِ موتیٰ" بھی استثنائی صورتوں میں وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔ گو عام قاعدہ یہی ہے کہ مُردے سُن نہیں سکتے۔

**نظریہ "برزخی قبر" کو مان لینے کا فائدہ اور ضرورت:**

عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ:

"دنیاوی قبر میں عذابِ قبر کا اثبات "حیات فی القبر" کے ہم معنی اور قبر پرستی کے شرک کی اصل اور بنیاد ہے"۔ (عذابِ قبر ص ۲۶)

اب دیکھیے جہاں تک شرک کی اصل بنیاد کے استیصال کا تعلق ہے، ہم بدل و جان عثمانی صاحب کے ساتھ ہیں۔ اختلاف صرف یہ ہے کہ وُہ شرک کی اصل بنیاد اس دُنیاوی قبر میں عذابِ قبر کا اثبات اور حیات فی القبر قرار دیتے ہیں جبکہ ہم شرک کی اصل بنیاد سماعِ موتیٰ کا علی الاطلاق وقوع قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی وجوہ درج ذیل ہیں:

۱۔ قبر میں زندگی اضطراری امور سے تعلق رکھتی ہے۔ دائمی اور مستقل ہرگز نہیں ہوتی۔

میت یا اس کی روح کا اس میں کچھ اختیار یا عمل دخل نہیں ہوتا۔

۲۔ پھر یہ نامکمل سی زندگی بھی ایسی ہے جس کا صحیح فہم ہمارے عقل و حواس سے ماوراء ہے۔ کیونکہ وہ عالم اور ہے اور یہ عالم اور۔ لہٰذا ان کی یہ زندگی بے کار ہے۔ نہ ہم انہیں کچھ سنا، یا بتلا سکتے ہیں۔ نہ وہ ہماری بات سن سکتے ہیں اور نہ ہی وہ ہمیں کچھ سنا، یا بتلا سکتے ہیں یا جواب دے سکتے ہیں۔ تو پھر ان کی زندگی کا ہمیں کیا فائدہ یا نقصان ہے؟ ان کی اس زندگی میں اللہ تعالیٰ یا اس کے حکم سے فرشتے ہی انہیں کچھ سنا، یا وہ ان سے کچھ سن سکتے ہیں یا سوال و جواب کر سکتے ہیں۔ گویا اصل مسئلہ جو شرک کی بنیاد بنتا ہے وہ سماعِ موتیٰ کا ہے نہ کہ دنیوی قبر میں عذاب اور حیات فی القبر!——— لہٰذا ہماری گزارش ہے کہ آپ حضرات اپنی جملہ مساعی سماعِ موتیٰ کی تردید میں صرف کیجئے۔ ان شاء اللہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

---

شعر و ادب

جناب اسرار احمد سہاوری

# نعت

تیرے دیوانے جو طیبہ کی جناں سے گزرے
روحِ بیتاب پکاری "یہ کہاں سے گزرے"

منزلِ شوق میں ہم سود و زیاں سے گزرے
عجب انداز میں عمرِ گزراں سے گزرے

کارواں تیرے تصور کا جو جاں سے گزرے
دل کا آئینہ رخِ لالہ رخاں سے گزرے

جو تیرے کوچۂ صد رشکِ جناں سے گزرے
وہ بصد ناز متاعِ دگراں سے گزرے

جستجو میں کہیں منزل کا تصور بھی نہ تھا
راہ بنتی گئی دیوانے جہاں سے گزرے

لذتِ غم نے دیا خوب سہارا دل کو
بے نیازی سے جہانِ گزراں سے گزرے

کچھ خبر بھی ہے اسے دل کی ہمارے کہ نہیں
جس مسیحا کے لیے منتِ جاں سے گزرے

راہ و منزل کا کہاں ہوش تھا دیوانوں کو،
نئے انداز سے گزرے ہیں جہاں سے گزرے

منتظر ہم ہیں سرِ راہِ غم اس کے اسرار
کاش وہ جانِ تمنا بھی یہاں سے گزرے